محمد ریاض

تقدیرِ امم اور علامہ اقبالؒ

اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے تصانیف میں اقوام و امم اور ان کے عروج و زوال کے بارے میں متعدد بصیرت افروز نکتے ملتے ہیں ۔ ان سب نکات کو یک جا کیا جائے تو ایک مبسوط کتاب بن جائے ۔ تاہم سرِ دست ایک مقالے کی وسعت تک بات کرنا مقصود ہے ۔ تقدیرِ امم دراصل ایک مہتم بالشان موضوع ہے جس پر تاریخ اور فلسفۂ عمران کا کوئی ژرف بیں مفکر ہی گفتگو کر سکتا ہے ۔ تاریخِ اسلام کے ہر دور میں ایسے کئی مفکرین اور فلاسفہ کے نام تلاش کیے جا سکتے ہیں جنھوں نے حیات و مماتِ ملل کے ضمن میں بحث کی ہے ، مگر علامہ ابن خلدون (م ۸۰۸/۱۴۳۲) کا نام ایسے حضرات میں غالباً معروف تر ہے ۔ عصرِ حاضر کو ایران کے نام ور شاعر ملک الشعرا محمد تقی بہار مشہدی (م ۱۳۷۰/۱۹۵۱) نے ''قرنِ اقبال'' کہا ہے ۔ اس لیے اس قرن کے اس خاص سال میں جس میں شاعرِ مشرق کی ولادت کو سو برس پورے ہو رہے ہیں ، تقدیرِ امم کے سلسلے میں ان کی فکر و نظر سے استفادہ کرنے کی خاص ضرورت ہے :

قرنِ حاضر خاصۂ اقبال گشت — واحدے کز صد ہزاران بر گذشت
شاعران گشتند جیش تار و مار — وین مبارز کرد کارِ صد ہزار
ہیکلے شد از سخن گوئی بپا — گفت 'کل الصید فی جوف الفرا'
عالم از حجت ہمی ماند تہی — فرق باشد از ورم تا فربہی

اقبال کے ہاں ایک مکمل ''جہاں بینی'' موجود ہے جسے وہ بجا طور پر ''جہاں بانی'' سے بھی مشکل قرار دیتے ہیں :

جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا !

مگر یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اقبال کے ''جہاں بانی'' اور ''جہاں بینی'' کے نظریات ان کی حکمتِ دین کے تابع ہیں :

ولایت ، پادشاہی ، علمِ اشیا کی جہاں گیری ،
یہ سب کیا ہیں ؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں !

اس لیے ان کی دیگر تعلیمات کی طرح ، تقدیرِ امم کے ضمن میں ان کے افکارِ عالیہ بھی اس مومنانہ بصیرت و فراست کے آئینہ دار ہیں جو قرآنِ مجید کی حکمت سے ماخوذ و مستنیر ہے ۔ فرماتے ہیں :

تقدیرِ امم کیا ہے ؟ کوئی کہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارہ

یعنی مومن کی بے خطا فراست تقدیرِ امم کو بے نقاب کر دیتی ہے ۔ ایک دوسرے شعر میں فرماتے ہیں :

چو سرمۂ رازی را از دیدہ فرو شستم
تقدیرِ امم دیدم پنہاں بہ کتاب اندر !

مقصد یہ کہ تقدیرِ امم قرآنِ مجید سے ہر عصر میں ہویدا رہے گی مگر اسے دیکھنے کے لیے امام فخر الدین رازی (م ۶۰۶/۱۲۰۹) کی ''تفسیرِ کبیر'' کی سی کتابوں کی ضرورت نہیں ۔ ان تفاسیر میں کلامی ، لغوی اور فقہی بحثیں ہیں ، مگر تقدیرِ امم دیکھنے کے لیے ''قلب'' کو آئینہ بنانا چاہیے تا کہ اس پر حقائق کا ''انعکاس'' ہو سکے ۔ ذیل کے شعر میں رازی کے علاوہ ان کے ایک پیش رو مفسر علامہ محمود زمخشری (م ۵۳۸/۱۱۴۸) کی طرف بھی اشارہ ہے :

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی ، نہ صاحبِ کشاف

بنا بر ایں ، قرآنِ مجید کے ان راہنما اصولوں کو پیشِ نظر رکھنا ضروری

ہے جن کی طرف ، تقدیرِ امم کے ضمن میں ، اقبال اشارہ فرماتے ہیں ۔ مگر یہاں ایک دوسرے نکتے کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ اسلام کے ضوابط و اصول ازلی و ابدی اور فطری ہیں ، اس لیے کسی مسلم یا غیر مسلم قوم کے ارتقا یا انحطاط کے سلسلے میں بحث کے دوران اس امر پر غور کرنا ضروری ہے کہ وہ کس حد تک خالقِ کائنات کے متعین کردہ اصول و قوانین کی پابند ہے ۔ یہ بات کتنی بھی عجیب نظر آئے ، مگر خلافِ واقعہ نہیں کہ مسلمانوں کے کئی کام ''خلافِ اسلام'' ہیں ، اور غیر مسلموں کے متعدد معمولات ''مطابقِ اسلام'' ۔ اس لیے مسلمان پورے طور پر اسلام پر عمل نہ کر کے مغضوبِ باری ہو رہے ہیں ۔[1] مگر غیر مسلم ، اسلام کے بعض اصول اپنانے کی برکتوں سے مستفیض ہیں ۔ اقبال کے ہاں ''کافروں'' کی ''مسلم آئینی'' اور نام نہاد مسلمانوں کی ''کفر دستوری'' کا ذکر کئی موقعوں پر آیا ہے ؛ اور یہ غور طلب ہے :

کافروں کی 'مسلم آئینی' کا بھی نظارہ کر
اور اپنے مسلموں کی مسلم آزاری بھی دیکھ

* * *

عدل ہے فاطرِ ہستی کا ازل سے دستور
'مسلم آئیں' ہوا کافر تو ملے حور و قصور

* * *

کافر ہے مسلماں ، تو نہ شاہی ہے نہ فقیری
مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی
کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیرِ مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

عروج و زوالِ ملل

اقبال نے قرآنِ مجید میں موجود اقوام کے عروج و زوال کے چند اصولوں کی طرف کئی بار اشارہ کیا ہے ۔ انھیں حیاتِ اقوام ، اجتماعی تعزیر

۱۔ دیکھیے سورہ ۲ ، آیہ ۲۰۸ ۔

احساسِ ذمہ داری اور تغیرِ استعداد کے نام دیے جا سکتے ہیں ۔

حیاتِ اقوام ۔ مقصد یہ کہ افراد کی طرح اقوام کے لیے خاتمے اور اضلال کا وقت مقرر ہے ۔[۲] البتہ افراد کی طرح اقوام کی عمریں کبھی مختصر ہیں اور کبھی طولانی ۔ انفرادی جسمانی صحت کی مانند ، اقوام کی طولانیٔ عمر کی خاطر سخت کوشی ، صداقت و عدالت اور عیش پرستی سے اجتناب ضروری ہے ۔ اقبال فرماتے ہیں کہ تن آسان اور باطل پرست اقوام جلد صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہیں ۔ کئی زحمت کش اقوام کی تاریخ دیکھ لیں ، ''شمشیر و سناں'' کو ترک کر کے ''طاؤس و رباب'' اپنانے پر ان کا سلسلۂ حیات جلد منقطع ہو گیا :

گرچہ اس دیرِ کہن کا ہے یہ دستور قدیم
کہ نہیں میکدہ و ساقی و مینا کو ثبات
قسمتِ بادہ مگر حق ہے اسی ملت کا
انگبیں جس کے جوانوں کو ہے تلخابِ حیات

* * *

ہر ہلاکِ اُمتِ پیشیں کہ بود زانکہ بر جندل گماں بردند عود

* * *

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیشِ جہاں کا دوام
وائے تمنائے خام ، وائے تمنائے خام

* * *

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے ؟
شمشیر و سناں اوّل ، طاؤس و رباب آخر

اُوپر منقول وسطی شعر مولانائے رومؒ (م ۶۷۲/۱۲۷۳) کا ہے جسے اقبال نے ''پیامِ مشرق'' اور ''بالِ جبریل'' میں تضمین کیا ہے ۔ سخت کوشی ، تن آسانی اورحمیت و بے حمیتی کے پیمانوں سے اقبال نے بعض اقوام کے عرصۂ حیات کو ماپا بھی ہے ۔ بدیہی مثالیں مغلیہ خاندان (= تیموریانِ ہند) اور ترکانِ عثمانی کی ہیں ۔ پہلے خاندان نے کوئی دو سو برس

۲۔ دیکھیے مثلاً سورہ ۷ ، آیہ ۳۴ ۔

تک جفا کشی اور سخت کوشی کو اپنا شعار بنائے رکھا (۹۳۲/۱۵۲۶ تا ۱۱۱۹/۱۷۰۷ ، از بابر تا اورنگ زیب) ، مگر اس کے بعد بالعموم تن آسانی اور بے حمیتی کا دور دورہ رہا تا اینکہ اُنیسویں صدی عیسوی کے وسط کے چند سال بعد یہ خان وادہ ختم ہو گیا ۔ اس کے مقابلے میں ترکانِ عثمانی کی مجاہد اور مبارز قوم صدیاں گزر جانے کے باوجود سرگرمِ ترقی ہے ۔ نظم ''غلام قادر رہیلہ'' (''بانگِ درا'') غور طلب ہے کہ :

مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر
حمیت نام ہے جس کا ، گئی تیمور کے گھر سے

کہیں کہیں علامہ مرحوم تجاہلِ عارفانہ بھی اختیار فرماتے ہیں :

کوئی تقدیر کی منطق سمجھ سکتا نہیں ورنہ
نہ تھے ترکانِ عثمانی سے کم ترکانِ تیموری

* * *

درفشِ ملتِ عثمانیاں دوبارہ بلند
چہ گویمت کہ بہ تیموریاں چہ افتاد ست

قرآنِ حکیم میں کئی غلط کار اقوام کا تعزیر آمیز انجام بیان ہوا اور ان کے واقعات سے عبرت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی ۔ اقوامِ سابق کے بڑے جرائم شرک (= توحید کی مخالفت) ، بدکاری ، کبر اور بد معاملگی (ناپ تول میں کمی اور نفع اندوزی وغیرہ) تھے اور ان معائب سے اقوامِ حاضر کہاں مبرا ہیں ؟ مجرم اقوام جلد یا بدیر اپنے کیفرِ کردار کو پہنچیں گی کیونکہ قوم کی تقاصیر ناقابلِ معافی ہیں ، مگر اس معاملے میں اقبال ملتِ اسلامیہ کے لیے ایک استثنا کے قائل تھے ۔ یہ استثنا اس حد تک ہے کہ ملتِ اسلامیہ اپنی تقاصیر کی بنا پر صفحۂ ہستی سے نہیں مٹے گی مگر آلام و مصائب سے دوچار ہوتی رہے گی ۔ اقبال کی یہ تعبیر نکتۂ قرآنیہ کی شرح ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید کی حفاظت اپنے ذمے لی ہے[۳] اور اسی کتابِ عظیم میں وارد ہے کہ چراغِ اسلام کبھی نہیں بجھے گا ۔[۴] اس لیے ظاہر ہے کہ قرآن اور اسلام کی محافظ قوم ابد الآباد تک موجود رہے گی :

۳- ۱۵ : ۹ ۔ ۴- ۸ : ۳۲ ۔

گرچہ ملت ہم بمیرد مثلِ فرد — از اجل فرماں پذیرد مثلِ فرد
اُمتِ مسلم ز آیاتِ خداست — اصلش از ہنگامۂ 'قالوا بلیٰ' ست
از اجل ایں قوم بے پرواستے — استوار از 'نحن نزلنا' ستے
ذکر قائم از قیامِ ذاکر است — از دوامِ او دوامِ ذاکر است
تا خدا 'ان یطفئوا' فرمودہ است — از فسردن ایں چراغ آسودہ است

اقبال تاریخِ اسلام کے مطالعے سے دل گرم تھے کہ متعدد تباہی انگیز فتنوں سے دوچار ہونے کے باوجود ملتِ اسلامیہ بفضل اللہ موجود ہے، مگر دو تین مقام پر ("جاوید نامہ" : فلک عطارد اور "ارمغانِ حجاز" : حضورِ حق) انھوں نے عصرِ حاضر کی مسلمان قوم کی بقا سے مایوسی کا اظہار بھی کیا ہے۔ عصرِ اقبال کی اُمتِ مسلمہ کا انحطاط واضح ہے، اور موجودہ مسلمان نسل کی اساسیاتِ اسلام سے روگردانی بھی، الا ماشاء اللہ۔ اقوام و ملل کا تغیر و تبدل اللہ تعالیٰ کے لیے مشکل نہیں[٥]، اس لیے اقبال ایک جگہ یہ خدشہ ظاہر کرتے ہیں کہ موجودہ اُمتِ مسلمہ شاید مٹ جائے اور اس کی جگہ ایک دوسری ملتِ اسلامیہ عالمِ ظہور میں آ جائے جو قرآنِ مجید کی تعلیمات پر بہتر اور بیشتر عمل پیرا ہو۔ دوسری جگہ وہ اس ملتِ منتظر کے ظہور کی دعا فرماتے اور اس کے اوصاف بیان کرتے ہیں :

"جاوید نامہ" (ص ۷۸ - ۸۲)

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است — رسم و آئینِ مسلماں دیگر است
در دلِ او آتشِ سوزندہ نیست — مصطفیٰؐ در سینۂ او زندہ نیست
بندۂ مومن ز قرآں بر نخورد — در ایاغِ او نمے بینم، نہ دُرد

* * *

ملتے می خواہد ایں دنیائے پیر — آنکہ باشد ہم بشیر و ہم نذیر!

* * *

محفلِ ما بے مے و بے ساق است — سازِ قرآں را نواہا باق است

٥- ١٣ : ٢٠ -

زخمۂ ما بے اثر افتد اگر آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور
ذکرِ حق از امتاں آمد غنی از زماں و از مکاں آمد غنی !

* * *

حق اگر از پیش ما بردارد ش پیشِ قومے دیگرے بگذاردش
از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن ہر زماں جانم بلرزد در بدن !
ترسم از روزے کہ محرومش کنند آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند !

''ارمغانِ حجاز'' (ص ۱۵ - ۱۶)

مسلماں فاقہ مست و ژندہ پوش است ز کارش جبرئیل[۴] اندر خروش است
بیا نقشِ دگر ملت بریزم کہ ایں ملت جہاں را بارِ دوش است
دگر ملت کہ کارے پیش گیرد دگر ملت کہ نوش از نیش گیرد
نگردد با یکے عالم رضامند دو عالم را بدوشِ خویش گیرد
دگر قومے کہ ذکرِ لا الٰہش بر آرد از دلِ شب صبح گاہش
شناسد منزلش را آفتابے کہ ریگِ کہکشاں روید ز راہش !

تعزیرِ اجتماعی دوسرا اصول ہے جس کا مدعا یہ ہے کہ "فطرتِ ازلی" کی نظر میں کسی ملت کا کام ایک یا چند افراد کے کام کے مقابلے میں کہیں اہم ہے - قرآنِ مجید میں ابولہب ، بلعم باعور ، فرعون اور قارون ایسے چند افراد کی تعزیر و تعذیب کا ذکر آیا ہے ، مگر از روئے سیاق وہاں بھی ملت کا ذکر اہم تر ہے - کتابِ حکمت میں بیشتر اہمیت اقوام کو حاصل ہے کیونکہ چند افراد بہرحال اقوام کا ایک جزو ہوتے ہیں - خدائے تعالیٰ جماعت اور قوم کے کام کو برکت دیتا ہے مگر ابلیسی خلل اندازیوں کے خدشے بھی نظر انداز نہیں کیے جا سکتے - اس لیے ملی اور قومی کاموں کے مالہٗ اور ماعلیہ کو پوری سوجھ بوجھ کے ساتھ سامنے رکھنا چاہیے ورنہ اجتماعی خطائیں قابلِ تعزیر اور ناقابلِ معافی ہوتی ہیں :

نا اہل کو حاصل ہے کبھی قوت و جبروت
ہے خوار زمانے میں کبھی جوہرِ ذاتی
شاید کوئی منطق ہو نہاں اس کے عمل میں
تقدیر نہیں تابعِ منطق نظر آتی

ہاں ایک حقیقت ہے کہ معلوم ہے سب کو
تاریخِ امم جس کو نہیں ہم سے چھپاتی
ہر لحظہ ہے قوموں کے عمل پر نظر اس کی
برّاں صفتِ تیغِ دو پیکر نظر اس کی

* • *

مجھ کو معلوم ہیں پیرانِ حرم کے انداز
ہو نہ اخلاص تو دعویٰ نظر لاف و گزاف
اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروّت کے خلاف
اُس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف
فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

یہاں ضمنی طور پر اقبال کے فرد و ملت (یعنی ''خودی'' و ''بے خودی'') کے نظریات کی طرف اشارہ کرنا ناگزیر ہے - ان کی تفصیل ''اسرارِ خودی'' اور ''رموزِ بے خودی'' نام کی مثنویوں میں ہے اور اقبال کا یہ فلسفہ ایک نصف صدی سے عالم گیر ہو چکا ہے - اقبال نے فرد کی تعمیرِ سیرت (خودی) کو قومی خدمت کے تابع رکھا ہے (بے خودی) کیونکہ ان کا محبوب فرد روسو کا ''امیل'' نہیں ہے - وہ اپنے مسلمان معاشرے کا خدمت گذار اور بہبودی خواہ ہے :

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

* • *

فرد می گیرد ز ملت احترام — ملت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود — قطرۂ وسعت طلب قلزم شود
در جماعت خود شکن گردد خودی — تا ز گلبرگے چمن گردد خودی

مگر اقبال کی نظر میں ''قوم'' کا نظریہ سیاسیات کی کتب اور مغربی تصوّر

قومیت سے مختلف ہے ، خصوصاً اُمتِ مسلمہ کے حوالے سے ۔ ان کے اشعار ، انگریزی خطبات (خطبہ پنجم خصوصاً) ، مقالات ، مکاتیب اور بیانات میں اسلامی بین الاقوامیت کے علاوہ مسلمان ممالک کی انفرادی "قومیت" بھی اجاگر ہے (خطبات میں ایران اور ترکیہ کے حوالے سے) ۔ اقبال اس معاملے میں سید جمال الدین افغانی (م ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۷ء) کے ہم خیال ہیں جو مسلمان ممالک کے انفرادی تشخص کے حامی تھے ، مگر اس کے ساتھ ساتھ ان کے ممکنہ اتحاد اور اشتراک کے داعی بھی ۔ یہ نکتہ قابلِ ذکر ہے کہ مسلمانوں کے تصورِ قوم میں "دین" ایک محور و مرکز ہے اور دیگر معاملات اسی سے مربوط و منوط ہیں :

قوم مذہب سے ہے ، مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں ، محفلِ انجم بھی نہیں

* * *

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
اُن کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

* * *

ربط و ضبطِ ملتِ بیضا سے ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو
ملت و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

علامہ منعوت بجا طور پر فرماتے ہیں کہ افراد اور ملت کا رابطہ ناقابلِ انفعال ہے ، اس لیے دانا دل افراد برے دن آ جانے پر ملت و قوم سے

قطعِ رابطہ نہیں کرتے بلکہ خزاں کی پژمردگی کو خندۂ بہار کی آمد کے انتظار میں بخوبی سہتے رہتے ہیں :

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
ہے لازوال عہدِ خزاں اس کے واسطے
کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے
ہے تیرے گلستاں میں بھی فصلِ خزاں کا دور
خالی ہے جیبِ گل زرِ کامل عیار سے
جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور
رخصت ہوئے ترے شجرِ سایہ دار سے
شاخِ بریدہ سے سبق آموز ہو کہ تو
نا آشنا ہے قاعدۂ روزگار سے
ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

''بالِ جبریل'' میں اقبال نے مولانا رومؒ کے درج ذیل اشعار کو تضمین کیا ہے ۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ ''صاحبِ دل'' دردمند فرد کی دل آزاری قوم کے وبال کا موجب بن جاتی ہے (نظم ''پیر و مرید'') :

مریدِ ہندی

اب مسلماں میں نہیں وہ رنگ و بُو سرد کیونکر ہو گیا اس کا لہو ؟

پیرِ رومی

تا دل صاحب دلے نامد بدرد ہیچ قومے را خدا رسوا نکرد

کسی دردمند اور مخلص ''صاحبِ دل'' شخص کی بد دعا کی تاثیر روحانیت پر ایمان رکھنے والے افراد کے لیے اچنبھے کا باعث نہیں ہو سکتی ، کہ بقولِ سعدی :

آتشِ سوزاں نکند باسپند آنچہ کند دودِ دلِ دردمند

مگر بالعموم اقبال نے قوم کو افراد پر ، حتیٰ کہ بادشاہوں پر بھی ، ترجیح دی ہے :

سکندر رفت و شمشیر و عَلَم رفت خراجِ شہر و گنجِ کان و یم رفت
امم را از شہاں پائندہ تر داں نمی بینی کہ ایراں ماند و جم رفت ؟

احساسِ ذمہ داری تیسرا اصول ہے جس کا دائرۂ عمل انفرادی اور اجتماعی زندگی کو محیط ہے اور جدید عمرانیات و سیاسیات کے ماہر بھی اس کی اہمیت پر روشنی ڈالتے رہے ہیں ۔ قرآنِ مجید میں یہ اصول بڑی سادگی کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ ہر کوئی اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے[٦] اور ایک کی بد عملی کسی دوسرے کے لیے باعثِ وبال و عذاب نہیں ہو سکتی ۔ احساسِ ذمہ داری کے ذریعے فرد و ملت اپنے اعمال کا محاسبہ کر سکتے ہیں کہ وہ ترقی و سربلندی کے کس معیار پر ہیں اور ملت کی عقب ماندگی کے ذمہ دار کون لوگ ہیں ۔ یہ ''خودی'' اور ''بے خودی'' کے ممکنات کا محاسبہ اور تجزیہ ہے اور اس کی مناسبت سے اقبال نے جوانوں اور معاشرے کے ذمہ دار و فعال افراد کے اعمال کی اس قدر تعریف کی ہے :

اگرچہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات
جو فقر سے ہے میسر تونگری سے نہیں
اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور
قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں

* * *

اُس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد
ناچیز جہانِ مہ و پرویں ترے آگے
وہ عالمِ مجبور ہے ، تو عالمِ آزاد
موجوں کی تپش کیا ہے ؟ فقط ذوقِ طلب ہے
پنہاں جو صدف میں ہے وہ دولت ہے خدا داد

٦- ٦ : ١٦٤ -

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُر دم ہے اگر تُو تو نہیں خطرۂ افتاد

* * *

دگرگوں جہاں ان کے زورِ عمل سے بڑے معرکے زلدہ قوموں نے مارے

احساسِ ذمہ داری کا فقدان تقدیر امم کا ایک المیہ ہے ۔ کسی کاروان کو اگر اپنے متاع کے لٹ جانے کا احساس ہو ، تو اُمید کرنا چاہیے کہ وہ آئندہ محتاط تر ہوگا اور تلافیٔ مافات بھی کر لے گا ، لیکن احساسِ ذمہ داری سے محروم افراد نہ احتیاط برتیں گے نہ تلافیٔ زیاں کریں گے :

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

ایک قطعے "گلہ" ("ضربِ کلیم") میں اقبال برِصغیر کے باشندوں سے گلہ و شکوہ کرتے ہیں کہ ان کے احساسِ ذمہ داری کے فقدان نے اس سر زمین کو انگریزوں کا غلام بنا رکھا ہے (اور یہ شکوہ کتنا برحق تھا) :

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک
بے چارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے
دہقاں ہے کسی قبر کا اُگلا ہوا مردہ
بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے
جاں بھی گروِ غیر ، بدن بھی گروِ غیر
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے ، نہ مکیں ہے
یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے ، یورپ سے نہیں ہے

احساسِ ذمہ داری اور احساسِ جواب دہی ایک تصویر کے دو رخ ہیں ، خصوصاً اقبال کے دل خواہ معاشرے میں ۔ ایک مسلمان معاشرے میں حاکم ملت کے خادم ہوتے ہیں ۔ انھیں خدا کے سامنے جواب دہی کا احساس تو ہونا ہی چاہیے ، مگر وہ افرادِ ملت کے سامنے بھی جواب دہ ہوتے ہیں ۔ تاریخِ اسلام کے کئی ادوار میں ایسے حکم رانوں کی مثالیں موجود ہیں جو

تحکمانہ نہیں بلکہ خادمانہ انداز رکھتے تھے ۔ ان کی درویشانہ زندگی سب کے سامنے تھی اور وہ خدمت اور جواب دہی کو دعوت دیتے رہے ہیں ۔ اقبال نے کئی موارد میں ایسے حکم رانوں کی مثالیں دی ہیں ، جیسے :

سروری در دینِ ما خدمت گری است — عدلِ فاروقؓ و فقرِ حیدریؓ است
قائدِ ملت شہنشاہِ مراد — تیغِ او را برق و تندر خانہ زاد
ہم فقیرے ، ہم شہِ گردون فرے — اردشیرے باردانِ بوذرےؓ
غرق بودش در زرہ بالاؤ دوش — درمیانِ سینہ دل موئینہ پوش
آن مسلماناں کہ میری کردہ اند — در شہنشاہی فقیری کردہ اند
در امارت فقر را افزودہ اند — مثلِ سلمانؓ در مدائن بودہ اند
حکم رانے بود و سامانے نداشت — دستِ او جز تیغ و قرآنے نداشت

* * *

طبعِ روشن مردِ حق را آبروست — خدمتِ خلقِ خدا مقصودِ اوست
خدمت از رسم و رہِ پیغمبری است — مزدِ خدمت خواستن سوداگری است

اصولِ تغیر (تغیرِ استعداد) قرآنِ مجید کا وہ اہم اصول ہے جسے تقدیرِ امم میں بے حد اہمیت ہے اور اقبال نے اسے بڑی تفصیل سے بیان فرمایا ہے ۔ اس اصول کے ایک حصے کو ، جدید علمِ سیاست کی رو سے ، ذہنی کشاد اور روشن فکری کہہ سکتے ہیں ۔ اسلامی اجتہاد بھی یہی ہے ۔ اجتہاد میں قرآن و سنت و اجماع کی روشنی میں ، قیاس سے کام لیتے ہوئے ، علما نئے مسائل کا اسلامی تعلیمات سے انطباق کرتے ہیں ۔ اصولِ تغیر کے دوسرے حصے کو سر نوشت یا تقدیر کہتے ہیں ۔ اختصار سے یوں کہہ سکتے ہیں کہ اقبال نئے مسائلِ حیات کا مردانہ وار سامنا کرنے کی دعوت دیتے ہیں ، نیز تقدیر شکنی اور تغیرِ تقادیر کے نکتے سمجھاتے ہیں :

آئینِ نو سے ڈرنا ، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

* * *

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے

وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

* * *

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اُس میں
ناداں جسے سمجھے ہیں تقدیر کا زندانی

* * *

پابندیٔ تقدیر کہ پابندیٔ احکام ؟
یہ مسئلہ مشکل نہیں اے مردِ خرد مند
اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر
ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش ابھی خرسند
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

قرآنِ مجید میں کوشش و کار کو بے حد اہمیت دی گئی ہے (جیسے ۵۳ : ۳۹) - اس ام الکتاب میں یہ اصول بھی آیا ہے کہ افراد و ملل کی حالت میں تغیر و تبدل کے بغیر ان کی تقدیر نہیں بدلتی (۱۳ : ۱۱) - سورۂ رعد کی اس آیت کی (جسے اقبال نے دیباچۂ ''پیام مشرق'' میں نقل کیا ہے) مثبت و منفی تعبیرات ممکن ہیں - افراد یا ملل کی سر نوشت متعین نہیں اور نفس و ضمیر کے بدلنے سے تقدیر بدل سکتی ہے - افراد یا اقوام کے با استعداد ہو جانے پر ان کی تقدیر بہتر ہو جاتی ہے اور ان کی کم استعداد اور کاہل ہو جانے پر ان کی سر نوشت بھی زشت اور حوصلہ شکن صورت میں نمایاں ہوتی ہے - ان ہی اثباتی معانی میں اقبال "صدق و مروت" کو اپنا معمول بنانے والی اقوام کی اجتہادی غلطیوں کو قابلِ معافی سمجھتے ہیں اور ان کی تقدیر کو منقلب اور متغیر قرار دیتے ہیں :

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
کمالِ صدق و مروت ہے زندگی ان کی
معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں

قلندرانہ ادائیں ، سکندرانہ جلال
یہ اُمتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں

علامہ مرحوم نے بزبانِ نثر یوں لکھا ہے :

''مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوامِ مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو ۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے اور میں نے اپنے فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مدِ نظر رکھنے کی کوشش کی ہے ۔''[۷]

اقبال کی یہ تحریر تقریباً ۱۹۲۳ کی ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ ''انفس'' میں تغیر و انقلاب لانے اور توکل ، تدبیر و تقدیر نیز قناعت کے تازہ معانی بیان کرنے کا کام اقبال نے زیادہ اپنی فارسی کتابوں کے ذریعے انجام دیا ہے ، مگر ان کی اُردو شاعری یا اُردو اور انگریزی تحریریں ان معانی و مطالب سے خالی نہیں ہیں ۔ فارسی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

بپائے خود مزن زنجیرِ تقدیر — تہِ ایں گنبدِ گرداں رہے است
اگر باور نداری ، خیز و در یاب — کہ چوں پا واکنی جولاں گہے ہست

• • •

نالیدی و تقدیر ہماں است کہ بود است — آں حلقہ زنجیر ہماں است کہ بود است

نومید مشو ، نالہ کشیدن دگر آموز

گر ز یک تقدیر خوں گردد جگر — خواہ از حق حکمِ تقدیرِ جگر
تو اگر تقدیرِ نو خواہی روا ست — زانکہ تقدیراتِ حق لا انتہاست

۷- ''پیام مشرق'' ، دیباچہ ۔

ارضیاں نقدِ خودی در باختند نکتۂ تقدیر را نشناختند
رمزِ باریکش بحرفے مضمر است تو اگر دیگر شوی ، او دیگر است
شبنمی ؟ افتندگی تقدیرِ تست قلزمی؟ پایندگی تقدیرِ تست
نوع دیگر بیں جہاں دیگر شود ایں زمین و آسماں دیگر شود

کئی دیگر اکابرِ ملت کی طرح اقبال نے مسئلۂ جبر و اختیار یا تقدیرِ مقید و آزاد پر کافی لکھا ہے ۔ ان کے نزدیک انسان اپنے سر نوشت ساز اعمال میں آزاد ہے ، مگر اطاعتِ خدا اس کی آزادی میں اضافے کا موجب بنتی ہے ۔ وہ جس حد تک خدا کا مطیع ہوگا ، خدائی قویٰ اسی قدر اس کی معاون و مطیع ثابت ہوں گی ۔ شیخ سعدیؒ نے ''بوستان'' میں کہا تھا :

توہم گردن از حکمِ داور مپیچ کہ گردن نپیچد ز حکمِ تو ہیچ

اقبال اس بات کو یوں فرماتے ہیں (مثنوی ''اسرارِ خودی'' ، اطاعت مرحلۂ اول خودی) :

در اطاعت کوش اے غفلت شعار می شود از جبر پیدا اختیار
نا کس از فرماں پذیری کس شود آتش ار باشد ز طغیاں خس شود
شکوہ سنجِ سختیٔ آئیں مشو از حدودِ مصطفیٰؐ بیروں مرو

اقبال نے قناعت اور توکل کے عرفِ عام کے معانی قبول نہیں کیے ۔ ان کے نزدیک ، جبر و قدر کے بارے میں راہِ وسط اختیار کرنا ہی معقول روش ہے۔ ہمیں اپنی ممکنہ استعداد سے کام کرنا چاہیے مگر ساتھ ساتھ کامیابی کی خاطر خدا سے استعانت اور استمداد کرنا بھی راہِ صواب ہے ۔ توکل و قناعت یہی ہے ۔ بے عملی و بے کاری توکل و قناعت ہے ، نہ تقدیر سے مربوط ہے :

اسی قرآن میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پروین کا امیر
'تن بہ تقدیر ، ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

تھا جو ناخوب بتدریج وہی 'خوب' ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

• • •

غلام قوموں کے علم و عرفان کی ہے یہی رمزِ آشکارا
زمیں اگر تنگ ہے تو کیا ہے، فضائے گردوں ہے بے کرانہ
خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی ؟
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

• • •

تقدیر ہے اک نام مکافاتِ عمل کا دیتے ہیں یہ پیغام خدایانِ بالہ

''جاوید نامہ'' (فلک مشتری) میں اقبال فرماتے ہیں کہ مردِ مومن خوشنودیٔ خدا کے کام انجام دیتا ہے ، اور خدا بھی اس کے دل خواہ کاموں کی تکمیل میں اس کی مدد کرتا ہے ۔ وہ صحابہ کرامؓ کے کارناموں کے بارے میں غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں کہ آخر ان کے کام محدود و نامکمل کیوں نہ رہے ۔ چنانچہ حضرت خالدؓ بن ولید نے کسی جنگ میں شکست نہیں کھائی تھی ۔ حقیقت یہ ہے کہ مردِ مومن کی تدبیر ہمیشہ تقدیر کی شریک و دم ساز ہوتی ہے :

ہر کہ از تقدیر دارد ساز و برگ — لرزد از نیروئے او ابلیس و مرگ
جبر دینِ مرد صاحب ہمت است — جبرِ مردان از کمالِ قوت است
پختہ مردے پختہ تر گردد ز جبر — جبرِ مردِ خام را آغوشِ قبر
جبرِ خالدؓ عالم برہم زند — جبرِ ما بیخ و بنِ ما برکند
کارِ مرداں است تسلیم و رضا — بر ضعیفاں راست ناید ایں قبا
معنیٔ تقدیر کم فہمیدۂ — نے خودی را ، نے خدا را دیدۂ
مردِ مومن با خدا دارد نیاز — 'با تُو ما سازیم ، تُو با ما بساز'
عزمِ او خلاقِ تقدیرِ حق است — روزِ ہیجا تیرِ او تیرِ حق است

اس ضمن میں ''بالِ جبریل'' کا درجِ ذیل شعر شاعر کے بیان کا ایک نمایاں اعجاز ہے :

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے ؟

ذیل کے اُردو اشعار بھی اسی سیاق میں ہیں :

ذرا تقدیر کی گہرائیوں میں ڈوب جا تو بھی
کہ اس جنگاہ سے میں بن کے تیغِ بے نیام آیا
خودی کے ساز میں ہے عمرِ جاوداں کا سراغ
خودی کے سوز سے روشن ہیں اُمتوں کے چراغ

مگر مجھے اعتراف ہے کہ ''چشمِ سرمہ سا'' میں ''تقدیر کی گہرائیاں نظر آنے'' کی بات سمجھی نہیں جا سکی :

نظر آئیں مجھے تقدیر کی گہرائیاں اس میں
نہ پوچھ اے ہم نشیں مجھ سے وہ چشم سرمہ سا کیا ہے ؟

مندرجہ بالا چار اصولوں کے علاوہ اور بھی کئی ایسے اصول جستہ و گریختہ صورت میں تصانیفِ اقبال میں مبرہن ہیں جو حکمتِ قرآنیہ سے ماخوذ و مستنیر ہیں اور تقدیرِ امم سے جن کا گہرا تعلق ہے - ہم انھیں اجمالاً بیان کرتے ہوئے مسلمانوں کے موجودہ زوال و انحطاط کے بارے میں اقبال کے افکار کی طرف اشارہ کریں گے ، نیز بعض دیگر ضمنی امور کا ذکر بھی -

عروجِ امم کے وسائل

اقبال کے نزدیک انفرادی عروج ''خودی'' ہے اور ''عروجِ امم'' بے خودی - ان کے نزدیک عروجِ امم کے کئی وسائل ہیں ، مگر ''قوتِ یقیں''' ، ''حرکی نظامِ تعلیم'' ، ''جوشِ کردار'' اور ''فکر و عمل کی جدت'' غالباً ان وسائل میں اہم تر ہیں - ''یقین'' عقیدہ و عمل کی غیر متذبذب اور پائدار قوت ہے اور تقدیرِ امم میں اس کی بے حد اہمیت ہے :

دفعتہً جس سے بدل جاتی ہے تقدیرِ امم
ہے وہ قوت کہ حریف اس کی نہیں عقلِ حکیم
ہر زمانے میں دگرگوں ہے طبیعت اس کی
کبھی شمشیرِ محمدؐ ہے کبھی چوبِ کلیم[۴]

* * *

دین ہو ، فلسفہ ہو ، فقر ہو ، سلطانی ہو
ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر
حرف اس قوم کا بے سوز ، عمل زار و زبوں
ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر

اقبال کا یقین قرآنِ مجید میں مذکور ''ایمان'' کے مترادف ہے اور ظاہر ہے کہ عمل بلکہ سخت کوشی کا اس کے ساتھ گہرا رابطہ ہے ۔ اقبال نے اپنے انگریزی خطبات کے ''دیباچے'' میں اس حکمتِ قرآنیہ کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ یقین کی تعریف میں ان کے متعدد اشعار اس بے یقین عصر میں ایمان آفریں ہیں :

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا
یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے
یقیں پیدا کر اے غافل یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

* * *

یقیں مثلِ خلیل[۴] آتش نشینی
یقیں اللہ مستی ، خود گزینی

* * *

سن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار
غلامی سے بہتر ہے بے یقینی

* * *

مقامِ شوق بے صدق و یقیں نیست یقیں بے صحبتِ روح الامیں[۴] نیست

گر از صدق و یقیں داری نصیبے قدم بیباک نہ، کس در کمیں نیست

* * *

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا ؟
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
یقیں محکم ، عمل پیہم ، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اقبال کے تعلیمی افکار پر بہت لکھا جا چکا ہے ۔ انہوں نے عام تبصرود اور اساتذہ یا مدارس کے انتقاد کے پردے میں یہ بات روشن کی ہے کہ تعلیم کا منشا بھر پور شخصیت والے افراد کی تولید اور اممِ غیور کی تشکیل ہے :

جس پیرِ فلک نے ورق ایام کا الٹا
آئی یہ صدا 'پاؤ گے تعلیم سے اعزاز'
آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل
دنیا تو ملی ، طائرِ دیں کر گیا پرواز
دیں ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی
فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیر ، زمیں تاز
مذہب سے ہم آہنگیٔ افراد ہے باقی
دیں زخمہ ہے ، جمعیتِ ملت ہے اگر ساز
بنیاد لرز جائے جو دیوارِ چمن کی
ظاہر ہے کہ انجامِ گلستاں کا ہے آغاز
پانی نہ ملا زمزمِ ملت سے جو اس کو
پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز

* * *

شکایت ہے مجھے یا رب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاک بازی کا

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

• • •

چو می بینی کہ رہزن کاروان کُشت چہ پرسی کاروانے را چساں کُشت
مباش ایمن ازاں علمے کہ خوانی کہ از وے روحِ قومے می تواں کُشت

''جوشِ کردار'' اور ''جدتِ فکر و عمل'' کے بارے میں بالترتیب اقبال نے نپولین (م ۱۸۲۱) اور مسولینی (م ۱۹۴۵) کے طرزِ عمل کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ علامہ مرحوم نے تیسری گول میز کانفرنس کے اختتام پر فرانس اور اٹلی میں گزر فرمایا تھا ۔ نپولین کی قبر دیکھ کر اور مسولینی سے ملاقات کر کے انھوں نے اپنے اثرات بیان فرمائے جو ''بالِ جبریل'' کی دو نظموں کی صورت میں دیکھے جا سکتے ہیں ۔ یاد رہے کہ نپولین یا مسولینی ، اقبال کے نقطۂ نظر سے ، کوئی مثالی حکم ران نہ تھے بلکہ موخر الذکر پر بعد میں انھوں نے انتقادات بھی لکھے ہیں ، مگر دوسروں کے اچھے اوصاف کی تعریف کرنے میں اقبال نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا ہے :

راز ہے ، راز ہے ، تقدیرِ جہان تگ و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع
کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز
جوشِ کردار سے تیمور کا سیلِ ہمہ گیر
سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز
صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر
جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز

• • •

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ؟ ذوقِ انقلاب
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ؟ ملت کا شباب
ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی
ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارہ لعلِ ناب

''بانگِ درا'' کا ایک قطعہ ''ارتقا'' ، جس میں اقبال مسلمانانِ عرب کی مبارزہ آمیز زندگی کی مثال دیتے ہیں ، اس ضمن میں اور بھی معنی خیز ہے ۔ اس کا آخری فارسی شعر فرج ترشیزی (گیارھویں صدی ہجری کے ایک ایرانی شاعر مقیم حیدر آباد دکن) کا ہے :

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بو لہبی
حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اس کی مشکل کشی ، جفا طلبی
سکوتِ شام سے تا نغمۂ سحرگاہی
ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی
کشاکشِ زم و گرما ، تپ و تراش و خراش
ز خاکِ تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی
مقامِ پست و شکست و فشار و سوز و کشید
میانِ قطرۂ نیساں و آتشِ عنبی
اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام
یہی ہے راز تب و تابِ ملتِ عربی
''مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند ، آفتاب می سازند''

اقبال ملت کے لیے مفید اور پابندِ ضابطۂ ''قوت'' کے حصول کے آرزومند تھے ۔ اسی لیے وہ قوت و شکوہ سے محروم نبوت کو بھی اہمیت نہیں دیتے :

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک
تاریخِ امم کا یہ پیامِ ازلی ہے
'صاحبِ نظراں ، نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

لا دیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

• • •

دنیا کو ہے اس مہدیؑ برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار
فتنۂ ملتِ بیضا ہے امامت اُس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے
محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز
وہ نبوّت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش
جس نبوّت میں نہیں قوّت و شوکت کا پیام
ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

اقبال کا مہدی یا مردِ منتظر وہی ہے جو خود آگاہ اور خودی گستر ہو ۔ ان کے نزدیک ملت کی بیداری کی خاطر مہدی ، مردِ منتظر یا فوق البشر کے تصوّرات کی تشہیر بُری نہیں ۔ اس ضمن میں وہ نیٹشے (م ۱۹۰۰) کے تصوّرِ فوق البشر اور جرمنوں کی بیداری کی مثال دیتے ہیں :

قوموں کی حیات ان کے تخیل پہ ہے موقوف
یہ ذوق سکھاتا ہے ادب مرغِ چمن کو
'مجذوبِ فرنگی' نے بانداز فرنگی
مہدی کے تخیل سے کیا زندہ وطن کو
اے وہ کہ تو مہدی کے تخیل سے ہے بیزار
نومید نہ کر آہوئے مشکیں سے ختن کو
ہو زندہ کفن پوش تو میت اسے سمجھیں
یا چاک کریں مردکِ ناداں کے کفن کو؟

علامہ مغفور کی یہ جدت اور ندرت ملاحظہ ہو کہ وہ حسین بن منصور حلاج (م ۳۰۹/۹۲۱) کی شطحیاتی گفتگو "انا الحق" کو فرد کے لیے

ناروا مگر ملت کے لیے روا بتاتے ہیں ۔ مدعا یہ کہ فرد کا دعویٰ حقانیت گمراہ آمیز ہو سکتا ہے ، مگر ملتِ اسلامیہ کی سی ملتِ حق کے لیے ایسا ادعا نامناسب نہیں کیونکہ اسے اپنے راہِ حق پر گام زن ہو جانے کا یقین ہے ، اور خدا کے سوا اسے کسی کا غلبہ و تفوق منظور نہیں ہے ۔ ''انا الحق'' کی یہ ملی توضیح ''ارمغانِ حجاز'' میں دیکھی جا سکتی ہے کہ :

انا الحق جز مقامِ کبریا نیست — سزائے او چلیپا ہست یا نیست ؟
اگر فردے بگوید سرزنش بہ — اگر قومے بگوید ناروا نیست
بہ آن قوم انا الحق ساز گار است — کہ از خونش نمِ ہر شاخ سار است
نہاں اندر جلال او جمالے — کہ او را نہ سپہر آئینہ دار است
میانِ امتاں والا مقام است — کہ آن ملت دو گیتی را امام است
نیاساید ز کارِ آفرینش — کہ 'خواب' و 'خستگی' بروے حرام است
وجودش شعلہ از سوزِ درون است — چو خس او را جہانِ چند وچون است
کند شرح 'انا الحق' ہمتِ او — بے ہر 'کن' کی می گوید 'یکون' است
بجامِ نو کہن مے از سبو ریز — فروغِ خویش را بر کاخ و کو ریز
اگر خواہی ثمر از شاخِ منصور — بہ دل 'لا غالب الا اللہ' فرو ریز

رابطہ با ماضی کو اب ماہرینِ سیاسیات بھی اہمیت دینے لگے ہیں اور بالکل نیا طرزِ عمل اختیار کرنے والی اقوام ہی اس رابطے کی منکر ہوں گی ۔ مسلمانوں کا رابطہ انبیا و رسل کی تاریخ اور خصوصاً تاریخِ اسلام کے ساتھ ہے ۔ اقبال نے اس رابطے کو مستحکم رکھنے اور توحیدِ خداوندی کی نشر و اشاعت کے لیے ملتِ اسلامیہ کو کئی موارد میں تاکید کی ہے ۔ ذیل کے اشعار مثنوی ''رموزِ بے خودی'' میں سے ہیں اور ان میں دانائے راز اپنے فرضِ منصبی سے بخوبی عہدہ برآ ہوئے ہیں :

چیست تاریخ اے خود بے گانہ — داستانے ، حقہ ، افسانہ ؟
ایں ترا از خویشتن آگہ کند — آشنائے کار و مردِ رہ کند
روح را سرمایہ تاب است ایں — جسمِ ملت را چو اعصاب است ایں
شمع او بختِ امم را کوکب است — روشن از وے امشب و ہم دیشب است
غبط کن تاریخ را پاینده شو — از نفسہائے رسیدہ زندہ شو

دوش را پیوند با امروز کن — زندگی را مرغِ دست آموز کن
رشتۂ ایام را آور بدست — ورنہ گردی روز کور و شب پرست
سر زند از ماضیٔ تو حالِ تو — خیزد از حالِ تو استقبالِ تو
مشکن ار خواہی حیات لا زوال — رشتۂ ماضی ز استقبال و حال
موجِ ادراکِ نسلسل زندگی است — سرکشاں را شورِ قلقل زندگی است

• • •

نقطۂ ادوارِ عالم لا الٰہ — انتہائے کارِ عالم لا الٰہ
چرخ را از زور او گردندگی — مہر را پایندگی ، رخشندگی
بحر گوہر آفریدہ از تابِ او — موج در دریا تپیدہ از تابِ او
صد نوا داری چوخون در تن رواں — خیز و مضرابے بہ تارِ او رساں
زانکہ در تکبیر راز بود تست — حفظ و نشرِ لا الٰہ مقصود تست
تا نخیزد بانگِ حق از عالمے — گر مسلمانی نیاسائی دمے
می ندانی آیۂ ام الکتاب — امتِ عادل ترا آمد خطاب ؟[۸]
آب و تابِ چہرۂ ایام تو — در جہاں شاہد علی الاقوام تو
نکتہ سنجاں را صلائے عام دہ — از علومِ امیےؐ پیغام دہ
امیےؐ پاک از 'ھویٰ' ، گفتارِ او — شرح رمزِ 'ماغویٰ' گفتارِ او[۹]
اے کہ خور دستی ز سینائے خلیل[۴] — گرمیٔ خونت ز صہبائے خلیل[۴]
بر سرِ ایں باطل حق پیرہن — تیغِ 'لا موجود الا ھو' بزن
جلوہ در تاریکیٔ ایام کن — آنچہ برتو کامل آمد ، عام کن[۱۰]
لرزم از شرم تو چوں روز شمار — پرسدت آں آپروئےؐ روزگار
حرفِ حق از حضرتِ ما بردۂ — پس چرا با دیگراں نسپردۂ ؟

اقبال بیداریٔ دل (عقل پر عشق کی برتری) اور ادب برائے زندگی کو بھی عروج و سر بلندیٔ امم کے لوازم میں سے شمار کرتے ہیں :

دلِ بیدار فاروقیؓ دلِ بیدار کراریؓ
سرِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

۸- ۲ : ۱۴۳ - ۹- ۵۳ : ۲ - ۱۰- ۵ : ۳ -

دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاری ، نہ میری ضرب ہے کاری

* * *

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

* * *

جہانِ مہر و مہ زناریٔ اوست — کشاد ہر گرہ از زاریٔ اوست
پیامے دہ ز من ہندوستاں را — غلام آزاد از بیداریٔ اوست
دلِ ما آتش و تن موجِ دورش — تپید دمبدم سازِ وجودش
بذکرِ نیم شب جمعیتِ او — چو سیمابے کہ بندد چوبِ عودش

* * *

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے ، وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوز حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں ، وہ صدف کیا ، وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو ، وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا ؟
سرود و شعر و سیاست ، کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
ضمیرِ بندہ خاکی سے ہے نمود ان کی
بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں ، تو عینِ حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فنوں و افسانہ

ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

منقولہ اشعار کی بلاغت کا تقاضا ہے کہ بزبانِ نثر ان کی توضیح نہ کی جائے۔

امتِ مسلمہ کے اسبابِ زوال

امتِ مسلمہ کے معاصرانہ زوال (غلامی، علمی اور معاشرتی تقلید، نیز معاشی عقب ماندگی) کے اسباب اقبال نے کئی موارد میں گنوائے ہیں۔ جو اسباب انھوں نے بتائے، ان کے مزید شاخ و برگ نکالے جا سکتے ہیں اور بعض مسلمان ممالک کے مخصوص حالات کے پیشِ نظر بعض اسباب کا اضافہ بھی کر سکتے ہیں، مگر حکیم الامت کی کسی ایک تشخیص سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی شاہ کار تالیف "جاوید نامہ" میں انھوں نے مظلوم انسانوں اور مسلمانوں کے اسبابِ زوال بڑی صراحت سے بیان فرمائے ہیں۔ شاعر "ماورائے افلاک"، قوتِ عشق کے ذریعے، "جہانِ باری" کے حضور حوادثِ دنیا کو یوں بیان کرتا ہے:

غالباں غرق اند در عیش و طرب — کار مغلوباں شمارِ روز و شب
از ملوکیت جہانِ تو خراب — تیرہ شب در آستینِ آفتاب
دانشِ افرنگیاں غارت گری — دیربا خیبر شد از بے حیدری
آنکہ گوید لا الٰہ بے چارہ ایست — فکرش از بے مرکزی آوارہ ایست
چار مرگ اندر پے ایں دیر میر — سود خوار و والی و ملا و پیر

گویا کئی اقوام کو استبدادی نظام اور مغربی علم و دانش کی سفاکیت نے دبا رکھا ہے، مگر مسلمانوں کو بے مرکزیت (عدمِ اتحاد اور توحید کے مضمرات سے روگردانی) نے فکر و عمل سے محروم کر رکھا ہے، اور سود خوار، والی، ملا اور پیر ان کے لیے وبالِ جان بنے ہوئے ہیں۔

توحید کے اتحاد آموز تقاضے اقبال نے ایک اُردو قطعے میں یوں بیان فرمائے ہیں:

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلہ علمِ کلام

روشن اس ضو سے اگر ظلمتِ کردار نہ ہو
خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام
میں نے اے میرِ سپہ تیری سپہ دیکھی ہے
'قل ھواللہ' کی شمشیر سے خالی ہیں نیام
آہ ، اس راز سے واقف ہے نہ ملا نہ فقیہ
وحدت افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام
قوم کیا چیز ہے ، قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

"جاوید نامہ" میں بحث ایک دوسرے اسلوب سے ملتی ہے ۔ شاعر (زندہ رود) پوچھتا ہے کہ آیا مسلمان اپنے موجودہ زوال اور اضمحلال پر چپ سادھ لیں یا ان کی تجدیدی کوششیں نتیجہ خیز ہو سکتی ہیں ؟ ندائے جاں سے یہ پیغام ملتا ہے کہ احیائے مسلسل نا ممکن نہیں اور مسلمان توحید کے عملی تقاضے اپنانے سے دوبارہ سربلند ہو سکتے ہیں ۔ توحید کے عملی تقاضے یہ ہیں کہ ایک خدا ، ایک رسول ، ایک کتاب اور ایک مرکزِ ملی (کعبہ) کو ماننے والے اپنے فروعی اختلافی مسائل کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ، فکر و عمل کی وحدت و یگانگت کو اپنا اشعار و دثار بنائیں ۔

زندہ رود

چیست آئینِ جہانِ رنگ و بُو — جز کہ آبِ رفتہ می ناید بجُو
زندگانی را سرِ تکرار نیست — فطرتِ او خوگرِ تکرار نیست
زیر گردوں رجعت او را رواست — چوں ز پا افتاد قومے بر نخاست
ملتے چوں مرد کم خیزد ز قبر — چارۂ او چیست غیر از قبر و صبر

ندائے جاں

زندگانی نیست تکرارِ نفس — اصلِ او از حیّ و قیوم است و بس
قربِ جاں با آنکہ گفت 'انی قریب' — از حیاتِ جاوداں بردن نصیب
فرد از توحیدِ لاہوتی مشود — ملتِ از توحیدِ جبروتی مشود
بے تجلی نیست آدم را ثبات — جلوۂ ما فرد و ملت را حیات

ہر در از توحید می گیرد کمال / زندگی ایں را جلال ، آں را جمال
چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ ؟ / با ہزاران چشم بودن یک نگہ
اہلِ حق را حجت و دعویٰ یکے است / 'خیمہ ہائے ما جدا ، دلہا یکے است'
یک نگاہی را بچشمِ کم مبیں / از تجلی ہائے توحید است ایں
ملتے چوں می شود توحید مست / قوت و جبروت می آید بدست
مردہٴ ؟ از یک نگاہی زندہ شو / بگذر از بے مرکزی پائندہ شو
وحدتِ افکار و کردار آفریں / تا شوی اندر جہاں صاحب نگیں

ملوکیت ، جسے یہاں ''والی'' کے لفظ سے نمایاں کیا گیا ، اقبال کی اصطلاح میں صرف شاہی نظام ہی نہیں بلکہ ہر مستبد اور آمرانہ نظامِ حکم رانی (استحصالی طریق) ملوکیت کی ہی ایک صورت ہے :

کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے
یہ وجودِ 'میر و سلطاں' پر نہیں ہے منحصر
مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ 'سلطاں' غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر
شرعِ ملوکانہ میں جدتِ احکام دیکھ
صور کا غوغا حلال ، حشر کی لذت حرام

اقبال استبدادی اور استحصالی نظامِ سیاست کے بے حد خلاف تھے اور مظلوموں کی حمایت میں انھوں نے بڑی درد مندی دکھائی ہے :

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

• • •

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است / نظامش خام و کاوش ناتمام است
غلامِ فقر آں گیتی پناہم / کہ در دینش ملوکیت حرام است
خدا آں ملتے را سروری داد / کہ تقدیرش بدستِ خویش بنوشت
بآں ملت سروکارے ندارد / کہ دہقانش برائے دیگراں کشت

فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کے اجتماعی زوال کے چار بڑے اسباب میں سے

ایک یہی ملوکیت ہے ۔ نبی اکرمؐ نے قیصر و کسریٰ کے لیے حکم رانوں کی نابودی کا مژدہ سنایا تھا ، مگر بدقسمتی دیکھیے کہ خود مسلمانوں نے آج تک قیصر و کسریٰ اپنائے رکھے ہیں :

بندۂ مومن ز قرآن بر نخورد — در ایاغِ او نہ مے دیدم ، نہ دُرد
خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست — خود سرِ تختِ ملوکیت نشست
تا نہانِ سلطنت قوت گرفت — دینِ او نقش از ملوکیت گرفت
از ملوکیت نگہ گردد دگر — عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر

دوسرے اسباب میں سود خواری (ناجائزہ منافع خوری) ، مُلائی اور پیری مریدی ہے ۔ اسلام نے تجارت کی حوصلہ افزائی اور سود خواری کی کمر شکنی کی ، مگر اس معاملے میں اسلام کے نام لیواؤں کا طرزِ عمل عجیب رہا ہے ۔ انھوں نے بالعموم تجارت کو ترک کیے رکھا اور جنھوں نے یہ پیشہ اپنایا ، انھوں نے جائز منافع پر اکتفا نہ کیا ، بلکہ اکثراً زر اندوز اور سود خوار بن گئے ۔ ان محدود افراد نے اکثریت کا استحصال کیے رکھا ہے ۔ مُلاّ اور فقیہ ، پیر اور شیخ و صوفی کے خلاف اقبال نے بہت لکھا ہے اور یہ محض سخن گسترانہ باتیں نہیں ہیں ۔ مگر یاد رہے کہ اقبال کا ہدفِ تنقید دورِ انحطاط کے مُلاّ و صوفی ہیں ، وگرنہ اکابر علما اور شخصیت پرور صوفیہ کا انھوں نے ہمیشہ احترام کیا ہے ۔ ترکیہ کے ایک معاصر روشن فکر سیاست مدار شاہزادہ محمد سعید حلیم پاشا (۱۸۶۳ - ۱۹۲۱) کے افکار بھی اسی قسم کے تھے ۔ چنانچہ ان کے جس مبسوط مقالے کا انگریزی ترجمہ حیدر آباد دکن کے سہ ماہی مجلہ ''اسلامک کلچر'' کی سب سے پہلی اشاعت (جنوری ۱۹۲۷ء) میں شامل تھا ، اسی کے پیشِ نظر اقبال نے ''جاوید نامہ'' میں ان کا ذکر کیا ، اور ان ہی کی زبانی دورِ انحطاط کے علمائے سو اور مُلاؤں کے بارے میں یہ تبصرہ کیا ہے :

دینِ حق از کافری رسوا تر است — زانکہ مُلاّ مومنِ کافر گر است
از شگرفیہائے آں قرآں فروش — دیدہ ام روح الامینؑ را در خروش
ز آنسوئے گردوں دلش بیگانۂ — نزدِ او ام الکتاب افسانۂ
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد — ملت از قال و اقولش فرد فرد

دینِ کافر ، فکر و تدبیرِ جہاد دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد

اس ضمن میں ''ارمغانِ حجاز'' کی وہ دو بیتیاں قابلِ ذکر ہیں جن کا عنوان ''صوفی و مُلّا'' ہے ۔ ان میں صوفی و مُلّا کی گمراہ کن تاویلاتِ قرآن کا ذکر ہے ۔ پست ہمتی ملاحظہ ہو کہ بعض کی روزی ''مزار فروشی'' سے ہے ۔ وہ لوگوں کو دوزخِ عقبیٰ سے ڈراتے ہیں ، مگر دوزخِ غلامی کے خلاف ایک لفظ نہیں کہتے ۔ انھیں معابد و مکاتب کے فرنگی مآب ہونے سے کوئی خوف نہیں آتا اور قرآنِ مجید ایسی سراپا حکمت کتاب کو انھوں نے جھاڑ پھونک کا طومار بنا رکھا ہے :

ز من بر صوفی و مُلّا سلامے کہ پیغامِ خدا گفتند ما را
ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت خدا و جبرئیل[۳] و مصطفیٰ[۴] را

ز دوزخ واعظِ کافر گرے گفت حدیثے خوشتر از وے کافرے گفت
'نداند آں غلام احوالِ خود را کہ دوزخ را مقامِ دیگرے گفت'

مریدے خود شناسے پختہ کارے بہ پیرے گفت حرفِ نیش دارے
'بمرگِ ناتمامے جاں سپردن گرفتن روزی از خاک مزارے'

فرنگی صید بست از کعبہ و دیر صدا از خانقاہاں رفت 'لاغیر'
حکایت پیشِ مُلّا باز گفتم دعا فرمود 'یا رب عاقبت خیر'

بہ پندِ صوفی و مُلّا اسیری حیات از حکمتِ قرآں نگیری
بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست کہ از یاسینِ او آساں بمیری

ذیل کے اشعار میں صوفی و مُلّا کی بے عملی ، ریا آمیز دین داری ، سربزیری اور دعا و کرامات فروشی اور مسائلِ ملیہ سے بے توجہی اور بے بہرگی اس قدر نمایاں ہے کہ کسی توضیح کی ضرورت نہیں :

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

• • •

آنکہ بود اللہ او را ساز و برگ فتنۂ او حبِ مال و ترسِ مرگ

• • •

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال
ملا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

* * *

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں
بھالہ بے عملی کا بنی شرابِ 'الست'
فقیہِ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور
کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگِ دست بدست
گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست ؟

* * *

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات
یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ ملا و جمادات و نباتات

* * *

ز رومی گیر اسرارِ فقیری کہ آں فقر است محسودِ امیری
حذر زاں فقر و درویشی از وے رسیدی بر مقامِ سربزیری

* * *

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

* * *

رندوں کو بھی معلوم ہیں صوفی کے کمالات
ہر چند کہ مشہور نہیں ان کے کرامات
خود گیری و خود داری و گلبانگ انا الحق
آزاد ہو سالک تو ہیں یہ اس کے مقامات

محکوم ہو سالک تو یہی اس کا 'ہمہ اوست'
خود مردہ و خود مرتد و خود مرگِ مفاجات

بعض اشعار میں اقبال نے صوفی و 'ملا' کے ساتھ ساتھ جمود آموز شعرا کو بھی خبر لی ہے :

چہ گویمت کہ چہ بودی ، چہ کردۂ چہ شدی
کہ خوں کند جگرم را ایازۂ محمود
تو آن نئی کہ مصلیٰ ز کہکشاں می کرد
شراب صوفی و شاعر ترا ز خویش ربود

* * *

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

بہرحال ، 'ملاؤں اور خصوصاً صوفیوں کے نام اقبال کا پیغام یہ ہے کہ :

اے پیرِ حرم ، رسم و رہ ، خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی ، خود نگری کا
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے
مغرب نے سکھایا انھیں فن شیشہ گری کا

* * *

یہ حکمتِ ملکوتی ، یہ علمِ لاہوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکرِ نیم شبی ، یہ مراقبے ، یہ سرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ عقل ، جو مہ و پروین کا کھیلتی ہے شکار
شریکِ شورشِ پنہاں نہیں ، تو کچھ بھی نہیں
خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

* * *

این نکتہ کشائندۂ اسرارِ نہان است
ملک است تنِ خاکی و دیں ، روح و روان است
تن زندہ و جاں زندہ ز ربط تن و جان است
با خرقہ و سجادہ و شمشیر و سنان خیز
از خوابِ گران ، خواب گران ، خوابِ گران خیز
از خوابِ گران خیز

آخر میں مثنوی ''پس چہ باید کرد'' کی طرف اشارہ کر دیں ۔ یہ تقدیرِ امم کا آئینہ خانہ ہے ۔ اس میں اقبال نظام ہائے زندگی اور نظریاتِ حکم رانی پر روشنی ڈالتے ہیں ۔ ایک نظام انکارِ خدا پر مبنی ہے اور یہ جلد یا بدیر نابود ہو جائے گا کیونکہ الحاد ایک غیر معقول اور غیر منطقی روش ہے :

در مقامِ لا نیاساید حیات سوے الا می خرامد کائنات
لا و الا برگ و سازِ اُمتان نفیٔ بے اثبات ، مرگِ اُمتان

دوسرا نظام ''حکمتِ فرعونی" پر مبنی ہے جس میں دین و سیاست کی جدائی اور حکم راں پرستی کی تلقین ہے ۔ اس مطرود نظام میں دین کو بھی سیاست کے تابع رکھا جاتا ہے ، اور بدقسمتی سے پہلے نظام کی طرح اس نظام کا ابھی دنیا میں کافی تداول ہے :

دخترانِ او بزلفِ خود اسیر شوخ چشم و خود نما و خردہ گیر
ہر زمان اندر تلاشِ ساز و برگ کارِ او فکرِ معاش و ترسِ مرگ
منعمانِ او بخیل و عیش دوست غافل از مغز اند و اندر بندِ پوست
قوتِ فرماں روا معبودِ او در زیانِ دین و ایمان سودِ او
از حد امروزِ خود بیروں نجست روزگارش نقشِ یک فردا نہ بست
از نیاگان دفترے اندر بغل الامان از گفتہ ہائے بے عمل !
دینِ او عہدِ وفا بستن بغیر یعنی از خشتِ حرم تعمیرِ دیر

اقبال کا دل خواہ البتہ تیسرا نظام ہے جسے اسلامی نظامِ حیات کہ سکتے ہیں اور اقبال نے مثنوی میں اسے حکمتِ کلیمی کا عنوان دیا ہے ۔

یہ مردِ مومن کا نظامِ زندگی ہے جس میں دین و سیاست ایک ہیں اور اقبال کی تصانیف کا معتدبہ حصہ اسی نظام کی توضیح و تبیین کے لیے وقف رہا ہے ۔ اسی نظام نے ہر دور میں تاریخِ انسانی کو نیک نام کیا اور تقدیرِ امم کی پائداری اسی کے ساتھ مشروط ہے کیونکہ :

ابتدائے عشق و مستی قاہری است انتہائے عشق و مستی دلبری است
مردِ مومن از کمالاتِ وجود او وجود و غیر او ہر شے نمود

اسی طرح مثنوی ''مسافر'' کا وہ حصہ بھی توجہ طلب ہے جس میں اقبال نے افغانستان کے سابق بادشاہ کی ''تقدیرِ امم'' کے قرآنی فلسفے کی طرف راہنمائی فرمائی ہے ۔

اسلامی تصوف*

اسلامی تصوف کی یہی تعلیم ہے کہ وہ دین کے ساتھ دنیا بھی رکھے۔ اسلام رہبانیت کے خلاف ہے اور گھر بار، اہل و عیال کو ترک کر کے جنگلوں اور بیابانوں میں زندگی بسر کرنے کو ناپسند کرتا ہے۔ اسلامی تصوف ایسے یوگ کو جو صرف اپنی ذات کے لیے ہو ایک بے فیض اور خشک چشمے سے تشبیہ دیتا ہے۔ بے شک یکسوئی حاصل کرنے کے لیے خلوت و عزلت نشینی کی ضرورت ہے، لیکن تمام لوگ اس کے اہل نہیں ہوتے۔ در اصل ترکِ دنیا ایک بُرا نمونہ ہے اہل دنیا کے کاروبار کے لیے، بلکہ یہ صریح خلاف ورزی ہے الٰہی قانون کی جو انسانی نسل کے بڑھتے رہنے اور اس کے پھولنے پھلنے کا متمنی ہے۔

---

*جناب محمد دین فوق مرحوم کے اس سوال کے جواب میں کہ ''اسلامی تصوف دنیا داری کے متعلق کیا تعلیم دیتا ہے؟'' (مشمولہ ''طریقت'' برائے اگست ۱۹۱۴) : سید عبدالواحد معینی، مرتب، ''مقالات اقبال'' (لاہور، شیخ محمد اشرف، ۱۹۶۳)، ص ۱۳۶۔